انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

قیمت سالانہ تین روپے
ایک پرچہ نئے دس پیسے
تاریخ اشاعت
۱ ۸ ۱۵ ۲۲

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

جلد ۱۶ | علی گڈھ - ۲۲ مئی ۱۹۵۷ ع | شمارہ ۲۰

آج کا اردو افسانہ

احتشام حسین

آج کے اردو افسانے کے بارے میں اس مختصر مضمون میں صرف انھی افسانوں پر اظہار خیال کروں گا جو ہندوستان میں آزادی کے بعد لکھے گئے کیونکہ حصول آزادی ہماری قوم کی زندگی میں ایک ایسا نقطۂ انقلاب تھا جس میں سماجی، اقتصادی اور ذہنی کشمکش مضمر تھی۔

افسانے کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ اگر وہ زندگی کی صورت جد و جہد اور بدحالی کا مرقع نہ ہو۔ اردو کا مختصر افسانہ جو مسلسل تکمیل ہیئت کی جستجو میں مصروف رہا ہے، ان تمام چیزوں کی عکاسی کرتا ہے جو انفرادی اور سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے نظام کی غمازی کرتی ہیں۔ کرشن چندر، علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، دیوندر ستیارتھی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، اختر انصاری، بلونت سنگھ، سہیل عظیم آبادی، رضیہ سجاد ظہیر، انور عظیم اور اشک ان سب نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اور اپنے نظریات کے تحت ہندوستانی زندگی کو پیش کیا ہے اور اس کے دامن کو مالا مال کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔

انھوں نے سماجی زندگی کے اس وسیع ڈھانچے کے پس منظر کے ساتھ جو آزادی کے بعد عالم وجود میں آیا ہے، اپنے انفرادی تجربات کو پیش کرکے وقت کی پکار کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔ اگرچہ یہ ڈھانچہ بالکل نیا ہے تاہم اس کی جڑیں گذشتہ ہزاروں برسوں میں ہیں۔

آزادی کے بعد جن بے شمار خصوصی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان میں سے چند یہ ہیں۔ آزادی کی نوعیت کی تشخیص و تجزیہ، صدیوں کی غلامی کے برے اثرات سے چھٹکارا پانے کی جد و جہد، مذہبی جنون، فسادات، لوگوں کی ہجرت اور ان کی باز آبادکاری کا سوال، ثقافتی سہارے اور قومی توازن کی تلاش اور ایک ایسے فلسفۂ انسانیت کی تشکیل جو اس قدر مضبوط ہو کہ دنیا کے تمام امن پسند لوگوں میں یکجائی کو دیکھ سکے، نئے ڈھانچے میں قومی تعمیر کا عمل۔

یہ مسائل انفرادی تجربوں، خوابوں، ناامیدیوں اور ناکامیوں کے پہلو بہ پہلو رومانی یا حقیقت پسندانہ کہانیوں میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ اردو مختصر افسانہ میں پختگی پریم چند کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ انھوں نے ہمارے مصنفین کو عوامی زندگی کے واقعات و لمحات کو افسانوں میں پیش کرنا سکھایا۔ رومانی اور روحانی افسانہ نگاروں میں ان کی آواز زمانے کے مزاج سے مقابلتاً زیادہ مطابقت رکھتی تھی۔ مبنی بر مقصد تحریروں کا یہ رجحان بہت سے لکھنے والوں کے انداز فکر کا جزو بن گیا اور انھوں نے اپنی فنکارانہ صلاحیت سے اپنے پڑھنے والوں کی توجہ زندگی کی قیمتی اور قابل قدر چیزوں پر مبذول کی اگرچہ ایسا کرتے وقت انھیں ان لوگوں کے عتاب کا شکار بننا پڑا جو ادب میں آدرش واد کے قائل ہیں۔

مثال کے طور پر کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس نے اپنی بہترین کہانیاں فرقہ وارانہ کشیدگی پر لکھیں جو کافی غور خوض کا باعث ثابت ہوئی تھیں ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے مذہبی میل جول اور ہم آہنگی کا مصنوعی ڈھنگ سے پرچار کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یا ان میں سے کسی ایک فرقے کو قصوروار ٹھہرانے کی کوشش کی یا پھر دونوں کو بری الذمہ قرار دے کر سارا الزام غیر ملکی طاقت پر ڈال دیا۔ اس قسم کی نکتہ چینی ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہے جو ادب کو زندگی، اس کے حسن و جمال اور اس کے بھونڈے، بھیانک اور بدنما پہلوؤں سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔

لیکن یہ ایک اہم بات ہے کہ اردو کا مختصر افسانہ نگار خلل اعصاب کے مریضوں اور نقطۂ اعتدال سے ہٹے آدمیوں کا

افسانہ نہیں ہے۔ یہ محض بے خبری اور لاشعوریت کے تاریک خلاؤں میں بھٹکنے کی کہانی نہیں ہے۔ اس نے کرداروں کی تخلیق کے واسطے علم نفسیات سے کام لیا ہے۔

آج علی عباس حسینی، بیدی، کرشن چندر، حیات اللہ اختر انصاری، عصمت، احمد عباس، سہیل اور بلونت سنگھ وغیرہ ہمارے مقبول اور ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے افسانہ نگاروں نے بھی افسانے کے آرٹ اور تکنیک میں کافی اضافہ کیا ہے ان سب کا نقطۂ نگاہ سماجی اور انسان دوستی پر مبنی ہے حتی کہ محبت اور جنسیات پر بھی سماجی بیداری کے احساس کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ امارت پسندوں، کھوکھلے آدرش وادیوں، تنگ نظر دیش بھگتوں، سماج دشمن انفرادیت پسندوں اور رومانیت پسند لوگوں کی کردار نگاری ہمیشہ ایک تضحیک و حقارت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

متذکرۂ بالا مصنفین ایک ہی سیاسی عقیدے کے حامی نہیں ہیں اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سیاسی تصورات سے بے نیاز ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سماجی انصاف، مساوات، جمہوریت ترقی اور پُرامن زندگی کے آدرش، ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے سماجی برائیوں اور حکومتوں پر یکساں طور پر نکتہ چینی کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان میں سے بعض نے تو نہایت خوبی کے ساتھ مختلف تعمیری منصوبوں کی بھی تعریف کی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اردو کی کہانیاں پڑھے تو اسے ان میں بہت سے تجربے ملیں گے۔

کچھ عرصے سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے افسانہ نگار اپنے مشاہدے اور عوام کے متعلق خود حاصل کی ہوئی تازہ ترین معلومات کی بہ نسبت تخیل اور کتابی علم پر زیادہ دارومدار رکھتے ہیں۔ دیہی زندگی سے متعلق چند کہانیوں میں تو دیہاتیوں اور عام مرد اور عورتوں کی کردار نگاری اس طرح کی گئی ہے کہ اس میں مشاہدے کی کمی صاف نظر آتی ہے اور متوسط طبقے کی محبت، محرومی اور ناکامی وغیرہ کی کہانیاں تو محض ایک ہی چیز کو بار بار دہرانے کی مثال پیش کرتی ہیں۔

اس سے قبل کہ میں اس مختصر مقالے کو ختم کروں میں ان چند افسانوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ کرشن چندر کا "پانی کا درخت" "حسینی کا" "میرا گاؤں" اور "نوروز نامہ" بیدی کی کہانی "لاجونتی" خواجہ احمد عباس کا افسانہ "شکر اللہ کا" عصمت کی کہانیاں "جڑیں" اور "چوتھی کا جوڑا" حیات اللہ انصاری کی کہانی "شکر گزار آنکھیں" رضیہ کی کہانی "نیلی گٹھری" یہ سب افسانے ایسے ہیں جنھوں نے میری ناقص رائے میں نہ صرف اردو ادب بلکہ ہندوستانی ادب کو بھی مالا مال کیا ہے۔

امریکہ میں فن خوشنویسی اور قدیم قلمی نسخوں کی نمائش

نیویارک ۱۲ مئی۔ نیویارک پبلک لائبریری میں "مشرق کی کتاب" کے عنوان سے کتابوں کی ایک نمائش شروع ہوئی۔ جس میں عرب ایران اور ترکی کی خوبصورت اور تاریخی کتابیں اور قلمی نسخے پیش کئے جائیں گے۔

اس نمائش میں گیارہویں سے ۱۹ویں صدی تک ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے مصوری اور فن خوشنویسی کے بہترین اور نادر نمونے رکھے جائیں گے۔ نمائش کا اہتمام آرٹ اور تعمیرات کے شعبہ کے سربراہ اور سپنسر عجائب خانہ کے کیوریٹر کارل کپ نے کیا ہے بیشتر نادرات اس عجائب خانہ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

نمائش کا اعلان کرتے ہوئے کپ نے کہا کہ چونکہ امریکہ کی روز افزوں عالمی اہمیت نے حالیہ برسوں میں مشرقی علوم اور تصانیف میں دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ اس لئے ہم نے لائبریری کے غیر معمولی طور پر وسیع ذخائر کی تصویری نمائش کا فیصلہ کیا ہے۔

نمائش میں پیش کردہ نادرات میں سے ایک اہم چیز قزوینی کی تصنیف کائنات کا ایک ۱۴ویں صدی کے اواخر کا قلمی نسخہ ہے۔ اس تصنیف کی بنیاد پر بعد میں طبیعاتی علوم پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہ نسخہ ہسپانیہ میں اسلامی دور حکومت کی یادگار ہے جبکہ عربوں نے دنیائے مغرب کو علم طبیعات سے روشناس کیا تھا اگرچہ یہ نسخہ نامکمل ہے تاہم اس میں جانوروں، درختوں، پھولوں اور چٹانوں کی بے نظیر تصویریں شامل ہیں۔

ترک نادرات میں فردوسی کے شاہنامہ کا ترجمہ شامل ہے اسے ۱۵۰۰ء میں استنبول میں قاسم پاشا کی خانقاہ کے ایک درویش نے لکھا اور تصویروں سے مزین کیا تھا۔

ایران سے سولہویں صدی عیسوی میں ایک قلمی نسخہ پیش کیا گیا تھا جو نہایت نفیس چکنے اور لچک دار ترکستانی کاغذ پر لکھا گیا ہے اور جس میں پیغمبروں کی کہانیاں ہیں اس میں حضرت نوح۔ حضرت ابراہیم۔ اسمٰعیل۔ موسیٰ اور یعقوب علیہ السلام کے حالات مندرج ہیں۔

نمائش میں مشرق قریب بعید کے تقریباً ہر ایک ملک کے خوشنما تابناک قلمی نسخے اور نوشتے اور باہر کی کتابیں رکھی گئی ہیں۔ یہ نمائش جون کے آخر تک جاری رہے گی۔

ہماری زبان

۲۲ مئی ۱۹۵۷ء

ہندستان میں کتابوں کی نشر و اشاعت

دوسری جنگِ عظیم سے ہندستان میں کتابوں کی اشاعت نمایاں طور پر بڑھی ہے۔ جنگ نے بہت سے نوجوانوں کو جو کالجوں سے نکلے تھے ملازمتیں حاصل کرنے کا موقع دیا۔ ان کا لکھنے پڑھنے کا شوق ابھی تازہ تھا۔ حالات نے کچھ ذہنی بیداری بھی پیدا کر دی تھی اور زندگی کے اہم مسائل کا احساس ہو چلا تھا۔ چنانچہ ہندستان کی ہر زبان میں مطبوعات کی تعداد بڑھ گئی۔ آزادی نے اپنے ادب سے ایک نئی دلچسپی عطا کی اور چونکہ آزادی کے ساتھ بہت سی نئی پریشانیاں اور تنقیدیں بھی آئی تھیں۔ اس لئے ان کے متعلق اظہارِ خیال بھی ضروری تھا۔ فسادات کے سلسلے میں انسانیت رواداری اور تہذیب کے پرچار میں ادیبوں نے بھی حصہ لیا اور پڑھے لکھے لوگوں نے دل کھول کر ایسی کتابوں کا خیر مقدم کیا۔ پھر نئے ہندستان کی تعمیر، ماضی کا نئے سرے سے جائزہ۔ رنگوں کی کثرت میں وحدت کی تلاش، اپنے اور سماج کے لئے ایک فلسفۂ زندگی، ایک عقیدے اور ایک بنیاد کی جستجو نے مدد کی۔ ریاستی حکومتوں کو احساس ہوا کہ ادیبوں کو نام کے بغیر اور ادب کی سرپرستی کے دعوے کے بغیر بہت سے کام لے سکتے ہیں، اس لئے انھوں نے اس طرف سنجیدگی سے توجہ کی۔ علاقائی زبانوں میں تعلیم شروع ہوئی اور اس کی وجہ سے علمی اور سائنٹفک ادب کی ضرورت محسوس ہونے لگی غرض ان سب باتوں کی وجہ سے آج ہندوستان میں کتابوں کی نشر و اشاعت کی رفتار خاصی تیز ہے اور ان کا معیار بھی پہلے سے بہتر ہے۔

حال میں نیشنل لائبریری علی پور نے جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے مالی سال میں ۱۱۳۴۷ کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں غالباً چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بھی شامل ہیں لیکن اس معقول تعداد میں زیادہ تر درسی کتابیں ہیں درسی کتابوں کا عام معیار ابھی قابلِ اطمینان نہیں ہوا ہے۔ ان میں سے بیشتر تجارتی اغراض کے ماتحت لکھی جاتی ہیں۔ بہت کچھ چیخ پکار کے باوجود ابھی تک ان کا انتخاب خوبی کی وجہ سے نہیں ہوتا اثرات کی بنا پر ہوتا ہے۔ ان میں تعلیمی یا ادبی یا علمی ضروریات کا لحاظ کم ہوتا ہے خانہ پُری زیادہ۔ ضرورت ہے کہ ان کتابوں کا معیار ہر طرح بہتر ہو۔ ان کی تیاری پر پوری توجہ صرف کی جائے ان کی چھپائی روشن ہو اور ان میں صحت کا التزام رکھا جائے۔

مگر ادب کی مقبولیت درسی کتابوں سے نہیں عام کتابوں سے ہوتی ہے۔ عام کتابیں پہلے سے زیادہ چھپتی اور بکتی ہیں مگر ان کی خریداری زیادہ تر سرکاری ادارے کرتے ہیں۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے۔ اچھے ناول، سنجیدہ شاعری، ڈراما، تنقید، سوانح، تاریخ، سفرنامے، سائنٹفک معلومات کی کتابیں اب بھی کم بکتی ہیں صرف یہ نہیں کہ لوگوں کی قوتِ خرید کم ہے۔ خریدنے کا جذبہ اور کتابوں کی اہمیت کا احساس بھی کم ہے۔ پھر اچھے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کافی نہیں۔ ادیبوں کو ریڈیو میں یا محکمۂ اطلاعات میں ملازمت دینے سے ادب کی ترقی نہیں ہوتی۔ ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں جس میں کچھ لوگ لکھنے پڑھنے کو اپنی ساری زندگی کا مشغلہ بنا سکیں۔ مغربی ممالک میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے جو ادب کے ذریعے سے خاصی فراغت سے زندگی بسر کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے ادیب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ نئے کاپی رائٹ بل میں مصنفین کے لئے سہولتیں ضرور فراہم کی گئی ہیں۔ مگر ان سے مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اردو میں علاوہ عام مشکلات کے کچھ مخصوص مسائل بھی ہیں۔ اردو کا مصنف اگر اچھی کتاب لکھے تو وہ واقعی اتنی کم بکتی کہ وہ صرف اپنی کتابوں کی آمدنی پر قناعت نہیں کر سکتا۔ اردو جاننے والے ابھی کتابیں خریدنے کے عادی بھی نہیں ہوئے ہیں، دوستوں سے مانگ کر پڑھنے کے یا مصنفین کے ہدیے کے متمنی رہتے ہیں۔ ہمارے اچھے شاعروں کو سننے کے لئے مشاعروں میں ہزاروں کا مجمع ہوتا ہے۔ مگر ان کا کلام بہت کم لوگ خریدتے ہیں۔ اردو میں اب کتابوں کی طباعت بہتر ہو رہی ہے باطن کے ساتھ ظاہر پر بھی توجہ ہے مگر کاغذ اور دوسری اشیاء کی گرانی کی وجہ سے قیمتیں بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ کتابوں کے لئے کاغذ کو بہت مہنگا نہ ہونے دے اور اچھے اور سنجیدہ موضوعات پر لکھنے والوں کی کتابیں سرکاری اداروں کے لئے معقول تعداد میں خریدے۔ ادب کی ترقی کسی ایک ذریعے سے نہیں ہو سکتی اس کے لئے پورے سماج کو مل کر کوشش کرنا چاہئے ایسی ذہنی فضا کے بغیر نیا شعور ترقی نہیں کر سکتا۔ نہ اس زبردست خزانے سے تعمیری کاموں کے لئے طاقت حاصل کی جا سکتی ہے۔

تقریروں کا مرض

ہمارے ملک میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ لوگ تقریریں زیادہ کرتے ہیں، کام کم۔ لیڈروں کا تو خیر یہ پیشہ ہے وہ باتیں نہ

جائیں تو ان کی گاڑی کیسے چلے۔ لیکن عام لوگوں کو بھی تقریریں کرنے یا سننے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ جہاں کوئی مشہور آدمی آیا یا کسی لیڈر یا قومی رہنما کا جنم دن ہوا یا کسی مشہور واقعے کی یادگار منانے کا فیصلہ ہوا۔ سارے ملک میں تقریروں کا ایک سیلاب پھوٹ پڑتا ہے۔ تقریروں کا مرض ایک قسم کی ذہنی عیاشی ہے۔ لوگ پھر موضوع کو نہیں دیکھتے۔ کمال فن کی داد دینے لگتے ہیں یہ ایک قسم کی شعبدہ بازی ہے۔ اس سے عمل کی قوت مجروح ہوتی ہے تقریر کے اس مرض کی وجہ سے، لوگوں میں ذمے داری اور محنت کا احساس کم ہو گیا ہے، وہ توازن کھو بیٹھے ہیں۔ ذرا سی بات ان کے لئے قیامت ہو جاتی ہے۔ ذرا سا کام کارنامہ بن جاتا ہے، بونوں کو دیو پیکر قرار دے دیا جاتا ہے۔ کل جو معمولی آدمی تھے، ذرا سی گلے بازی سے ہیرو بن جاتے ہیں۔ اچھے سے اچھے خاموش تعمیری کام کی طرف لوگ متوجہ نہیں ہوتے۔ اسٹیج کے مداریوں کے پیچھے پھرتے ہیں۔ جو لوگ خلوت میں خونِ دل سے چراغ جلاتے ہیں ان کی مدھم روشنی کوئی نہیں دیکھتا، جو ڈرائنگ روم یا چوراہے یا پارک میں تیغ زبان کے جوہر دکھاتے ہیں ان کی چمک سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی۔ ایک آزاد ملک کے لئے یہ ذہنی بچپن باعث شرم ہے اور جتنی جلد ہم اس بچپن سے نکل سکیں اتنا ہی ہمارے لئے یہ اچھا ہوگا۔

شعرا چوراہوں پر مجمع لگا کر اپنا کلام سنائیں گے

کلکتہ ۱۰ مئی۔ عوام میں شاعری کا ذوق پیدا کرنے کے لئے مغربی بنگال کے نوجوان شعرا ۱۰ مئی سے ہفتہ شاعری منا رہے ہیں۔

نوجوان شعرا شہر کی گلی کوچوں میں نکل جاتے ہیں۔ چوراہوں پر، پارکوں میں کھڑے ہو کر راہ گیروں کا مجمع لگا کر اپنا کلام سناتے ہیں۔ اس مہم میں بنگالی زبان کے اسّی شعرا حصہ لے رہے ہیں کلکتہ کے شعرا نے یہ پروگرام فرانسیسی شعرا کی تقلید میں مرتب کیا ہے۔ فرانس کے شعرا پارکوں اور چوراہوں پر کھڑے ہو کر راہ گیروں کو اپنا کلام سناتے ہیں۔

معاصرین

ہندستانی زبانوں کے اخبارات

دیسی زبانوں کے اخبارات کو انگریزوں کے زمانے میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی ان میں شائع شدہ تنقیدی مقالوں شکایتی مراسلوں اور مضامین کو حکومت درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتی تھی عالم بالا میں عام طور پر ان زبانوں کے اخبارات کو "کنڑ پریس" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، آزادی کے بعد صورت حال میں جزوی تبدیلی ضرور ہو گئی ہے لیکن بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی اخبارات جس توجہ کے مستحق ہیں وہ توجہ ان کی طرف مبذول نہیں کی جا رہی۔ انتظامی مشنری ابھی تک ذہنی غلامی میں مبتلا ہے اور دیسی زبانوں کے اخبارات کے مقابلے میں وہ انگریزی پریس کو ہی ترجیح دیتی ہے درآں حالانکہ دیسی زبانوں کے اخبارات زیادہ پڑھے جاتے ہیں کیونکہ انگریزی زبان جاننے والوں کی تعداد محدود ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہندستانی زبانوں کے اخبارات میں جو تنقیدی مواد شائع ہوتا ہے اسے متعلقہ حکام اور وزرا تک اپنی صحیح شکل و صورت میں پہنچانے کا معقول انتظام کیا جائے ورنہ اس کے بغیر حکومت اور عوام کے درمیان صحیح رابطہ قائم نہیں ہو سکتا۔ محض نظریاتی طور پر اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کام نہیں چلے گا ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں موثر عملی قدم بھی اٹھائے جائیں انگریزی پریس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ چیز ناقابل برداشت ہے کہ آج بھی حکومت اور انتظامی شعبہ کی جانب سے خصوصی مراعات حاصل رہیں اور دیسی زبانوں کے اخبارات کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ اس فرق و امتیاز کو مٹانے کی طرف عاجلانہ توجہ مبذول کرے۔ (ندیم بھوپال)

مسعود اختر جمال کی تشویش ناک حالت

رائے بریلی (محلہ جہان آباد) ۱۴ مئی۔ اہلیہ مسعود اختر جمال کی معرفت بذریعہ ڈاک اطلاع ملی ہے کہ موصوف کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے اور اب حالت تشویشناک ہے۔ ان کی بیماری کا موجودہ سلسلہ چار ماہ سے ہے۔ پہلے دو ماہ تک وہ مشاعروں کی وجہ سے مسلسل سفر میں رہے جس کے باعث مرض بڑھتا گیا اور باقاعدہ علاج کی طرف توجہ نہیں کی جا سکی۔ بلند شہر کے مشاعرے میں ان کی تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی۔ اس کے بعد سے اب تک مرض کی شدت میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آج کل حال یہ ہے کہ آنتوں کے ورم کی شکایت کے ساتھ ساتھ سینہ میں درد کی تیز چمک اکثر اٹھتی ہے اور کبھی کبھی شدید دورے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے تک دوستوں کے خطوں کا جواب خود ہی لکھتے تھے لیکن اب خود کچھ لکھنے سے معذور ہیں۔

ان کے ہمدردوں، بہی خواہوں اور دوستوں کے بیشمار خطوط آ رہے ہیں جن میں ان کی خرابیٔ صحت پر فکر و تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ دار المصنفین سے شاہ معین الدین صاحب ندوی نے تحریر فرمایا ہے کہ مسعود اختر جمال کی شدید علالت کی اطلاع سے بڑی تشویش ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو شفا دے اور متعلقین کو مطمئن کرے۔ حضرت جگر مرادآبادی نے مندرجہ ذیل بیان برائے اشاعت ارسال فرمایا ہے

"اس مرتبہ کے طویل سفر کی واپسی پر مسعود اختر جمال کی خرابیٔ صحت کی اطلاع ملی جس سے تشویش و فکر لاحق ہو گئی عزیز موصوف کے خطوط سے مبہم طور پر لیکن ان کی بیگم کے مکتوبات سے واضح طور پر ان کی پریشانیوں کا علم ہوا۔ ان کی صحت برابر گرتی چلی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ مایوسی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ جمال شاعرانہ حیثیت سے جس ادبی مرتبہ کے مستحق ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے میرے نزدیک ادب پر ان کے احسانات کافی ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ انھیں کبھی نہیں بھلا سکے گی۔ وہ حساس، خود دار، غیور اور خاموش مزاج شاعر ہیں۔ دوسرے پر اپنے مصائب و آلام ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے۔ انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں ان کی ادبی جد و جہد ایک خاص مقام رکھتی ہے جس کی وجہ سے انھیں نہایت اذیت بخش حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ حیرت ہے کہ ان کی مشکلات کا سلسلہ آزادی کے حصول کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ یہ صورت حال کس حد تک روح فرسا ہے اس کا اظہار لفظ و بیان میں دشوار ہے۔ شعراء و ادبا کو حکومت کی جانب سے وظائف دئے جانے کا مبارک اقدام ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ نالائق سے نالائق شعراء کو اس کا مستحق سمجھ لیا گیا ہے اور نااہل سے نااہل ادیب اس کے اہل قرار دے دئے گئے ہیں۔ لیکن واقعتہً جو حضرات حقدار ہیں اور حقیقتہً حکومت کی امداد کے مستحق ہیں وہ پریشان حال و پریشان روزگار نظر آتے ہیں۔ میں بہرحال حکومت کو مورد الزام قرار نہیں دیتا لیکن جہاں سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے اس کا سد باب ضرور ہونا چاہئے۔ جمال صحیح معنوں میں حکومت کی توجہ کے مستحق ہیں۔ اس زمانہ میں ان کے احساسات یقیناً نازک سے نازک تر ہو گئے ہوں گے۔ خاموشی کے ساتھ انھیں جن مصائب کا مقابلہ درپیش ہے۔ اس کا مجھے شدید طور پر احساس ہے اور میری دماغی و روحانی اذیتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ میں ان کی جانب سے اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہوں۔ مجاز مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان کے بعد اس قسم کا دوسرا صدمہ برداشت کرنے کی سکت کہاں سے لاؤں۔ اردو ادب کے پرستاروں سے میں اپیل کرتا ہوں کہ جمال کی صحت یابی کے لئے ہر ممکن سعی و جد و جہد کریں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حکومت کے ذمہ دار اراکین کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے مزید یہاں ہمارے قومی اداروں کے اراکین کا فرض ہے کہ جمال کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کا انتظام جلد از جلد کریں۔ تاکہ ان کی کتابوں کی مالکی سے جو معاوضہ ملے اس سے ان کے علاج کا معقول ترین بندوبست کیا جا سکے۔ خصوصیت کے ساتھ میں انجمن ترقی اردو کی لٹریری کمیٹی کے اراکین کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔"

انجمن کی خبریں

برہان پور (مدھیہ پردیش)

صوبائی حد بندی سے قبل ہی کھنڈوہ میں واقع مدھیہ پردیش کے واحد اردو نارمل اسکول کو بالا پور منتقل کر دیا گیا۔ جواب صوبہ بمبئی کے حدود میں واقع ہے اور اس وسیع صوبہ میں اردو کا واحد نارمل اسکول بھی نہیں رہا اگرچہ ہندی کے کئی نارمل اسکول ہیں۔

اس امر کی جانب انجمن ترقی اردو برہان پور اور جمعیۃ علماء شہر برہان پور نے کئی بار صوبائی محکمہ تعلیم کی توجہ منعطف کرائی ابھی چند روز پیشتر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات بھوپال کی خدمت میں پھر ایک وفد انجمن ترقی اردو برہان پور کی جانب سے روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ معلوم ہوا ہے کہ برہان پور اور کھنڈوہ کے امیدواروں نے بھی موصوف کی خدمت میں ایک مشترکہ درخواست روانہ کی ہے اور یہ دریافت کیا ہے کہ داخلے کا امتحان کب اور کہاں ہوگا۔ کھنڈوہ کے ہندی نارمل اسکول نے داخلہ کی درخواستیں طلب کر لی ہیں اور ۱۵-اپریل کو آخری تاریخ بھی گزر چکی ہے لیکن غریب اردو والوں کو ابھی تک کوئی اطلاع نہیں دی گئی بہاکوشل میں برہان پور ہی ایسا مقام ہے جہاں میونسپل اردو پرائمری اسکولوں کے طلبہ کی تعداد ڈھائی ہزار اور اساتذہ کی تعداد ستر ہے جبریہ تعلیم کے نفاذ کی وجہ سے ہر سال اس تعداد میں کافی اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لحاظ سے برہان پور ہی ایسا موزوں مقام ہے جہاں فوری طور پر اردو نارمل اسکول قائم کیا جانا چاہیے ورنہ صوبہ کی اردو کی پرائمری تعلیم کو سخت نقصان پہنچے گا۔

محکمہ تعلیم کے ارباب حل و عقد اور صوبہ کے وزیر تعلیم سے گزارش ہے کہ وہ اس جانب فوری توجہ فرما کر برہان پور میں اردو نارمل اسکول قائم کرنے کے لئے بلا تاخیر عملی کارروائی فرمائیں۔

مرزا محمود بیگ ساز

(سکریٹری مہاکوشل انجمن ترقی اردو برہانپور)

گونڈہ

آج یہاں انجمن ترقی اردو کی جانب سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار کے سلسلے میں ایک محفل مشاعرہ جناب رام لال گپتا ایڈوکیٹ (نائب صدر انجمن ترقی اردو گونڈہ) کی کوٹھی "گپتا سدن" پر منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت جگر مرادآبادی نے فرمائی

جگر صاحب کے علاوہ جناب کرشن چندر حیرت ؔ، جناب رام چندر ناز، جناب محمد ندیم باقی۔ جناب ایشور مرتن، جناب سریش چندر جام اور دیگر مقامی شعراء نے شرکت کی۔

جامعہ اردو علی گڑھ

مکرمی۔ تسلیم!

ہمارے سنٹروں کے مہتمم صاحبان کے پاس سے جو خطوط آرہے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ جناب ڈاکٹر نامی صاحب نے بمبئی سے تین نئے امتحانات جاری کرنے کا اعلان کیا ہے اور ان سب صاحبان کو تعاون کے واسطے لکھا ہے جن کا تعلق جامعہ اردو کے امتحانات سے ہے۔

نامی صاحب نے سال گزشتہ اور امسال پھر ہم سے ایسی مراعات چاہی تھیں جو سراسر جامعہ اردو کے آئین و قواعد کے خلاف ہیں۔ ظاہر ہے وہ مراعات نہ ان کو سال گزشتہ دی گئیں نہ امسال دی جا سکتی ہیں۔ ممکن ہے ان کی یہ کوشش اسی انکار کا نتیجہ ہو۔ لیکن ایسے وقت پر جبکہ اردو کی ناؤ منجدھار میں ہو اور ہر طرف سے اردو کی شمع کو بجھانے کے لئے آندھیاں چل رہی ہوں۔ اس قسم کا محاذ ایک ایسے ادارہ کے خلاف قائم کرنا جس کی خدمات آپ سے پوشیدہ نہیں کہاں تک مناسب ہے اس کا فیصلہ آپ خود ہی کریں گے۔

بہرحال معاملہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم بہی خواہان جامعہ اردو کو یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی تخریبی کارروائیوں سے ان کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے

نیاز مند:۔ سید ظہیر الدین علوی

رجسٹرار جامعہ اردو

انور معینی (اجمیری)

اجمیر کی متعدد ہستی کے توسل سے "ہماری زبان" مطالعہ کے لئے نصیب ہو جاتا ہے۔ اچھی کتابت۔ طباعت۔ اور اچھے کاغذ پر سلیقے سے ترتیب دیئے ہوئے "ہماری زبان" کو دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوتی ہے۔ خدا اسے نظر بد سے بچائے اور آپ کے ارادوں کو استحکام بخشے۔ اردو رسم خط کے سلسلے میں آئے دن مضامین پڑھتا رہتا ہوں۔ سوچا میں بھی اپنی رائے کا اظہار کر دوں لہٰذا "اردو رسم خط کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک "مضمونچہ" بغرض اشاعت ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

اُردو دُنیا

دائرہ ادب کلکتہ کا سالانہ جلسہ

دائرہ ادب کلکتہ کا جشن تقسیم اسناد مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں منعقد ہوا جس میں مغربی بنگال اور بہار کے ممتاز شاعر، ادیب پروفیسر اور ماہرین تعلیم موجود تھے۔ اس جلسے کی صدارت جناب سعید احمد اکبرآبادی پرنسپل کلکتہ مدرسہ نے فرمائی۔

پروفیسر ہیرا لال چوپڑا نے اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو دشمن ملک و قوم کے دشمن ہیں۔ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ اس پر ہر طبقے کا حصہ ہے۔ پروفیسر چوپڑا نے فرمایا کہ ریڈیو کی سنسکرتی زبان سے تنگ آکر ہم ریڈیو بند کر دیتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے اردو پروگرام کی نشر و اشاعت کے لئے دائرہ ادب کا قدم مستحسن ہے۔

اس کے بعد جناب سعید احمد اکبرآبادی نے جامعہ اردو کلکتہ مرکز سے کامیاب ہونے والے طالب علموں کو اسناد تقسیم کیں۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں مغربی بنگال میں اردو کی موجودہ پوزیشن پر مدلل اور بسیط تقریر کی۔ اور جامعہ اردو کے کامیاب طلبا کو مبارکباد دی۔ آخر میں پروگرام کے مطابق جناب شیخ نشاط نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد دوسری نشست مشاعرے کی شکل میں شام کو ۷ بجے ہوئی۔ یہ مشاعرہ پروفیسر عباس علی خاں بیخود کی صدارت میں ہوا۔ تقسیم بنگال کے بعد مغربی بنگال کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ آل انڈیا ریڈیو کلکتہ نے دائرہ ادب کے اس مشاعرے کو ریکارڈ کیا۔ جو آئندہ کسی تاریخ میں آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر کیا جائے گا۔

کیپٹن میجر ابو جعفر کشفی نے مشاعرے کا افتتاح کیا جن شعرا نے مشاعرے میں حصہ لیا ان میں چند کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

سعید احمد اکبرآبادی، نواب دہلوی، محمود طرزی، سالک لکھنوی، پرویز احسان دربھنگوی، شمس عظیم آبادی، مظفر حنفی، تابش دہلوی، رضا مظہری، اطہر سلیمان، شباب لکھنوی، جوہر غازیپوری، ہرجیت ثانی، پروفیسر ہیرا لال چوپڑہ، بنکیم جی دیپ نارائن کھوسلہ، وکیل اختر آنند، مجید عبدل، کیف پرتاب گڑھی حبیب آرزوی۔

شام کو ۴ بجے سے مشاعرے کے اختتام تک اردو نمائش کا انتظام کیا گیا۔ اردو دوستوں نے خاص طور پر جانے آرٹسٹ جناب مجید عبدل کے بنائے ہوئے ادبی کارٹونوں کو پسند کیا۔

ادبی اکیڈمی لکھنؤ

ادبی اکیڈمی لکھنؤ کے عہدیداروں اور ہمدردوں کا ایک خصوصی جلسہ نصیر منزل نیا گاؤں میں منعقد ہوا جلسہ میں گزشتہ کارروائی کی تصدیق کی گئی اور مطبوعہ دستور العمل اور فارم ممبری پیش کیا گیا۔ اکیڈمی کے ترجمان "جائزہ" کی اشاعت اور مضامین پر بحث کی گئی اور طے پایا کہ پہلا شمارہ جلد سے جلد "لکھنؤ اور پہلی جنگ آزادی" پر مشتمل ماہ جون ۵۷ء تک شائع ہو جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، پروفیسر عبدالاحد خاں خلیل اور شیخ تصدق حسین تیر وغیرہ ممتاز اہل قلم حضرات جائزہ کے لئے مضامین تحریر فرما رہے ہیں۔

جلسہ میں اکیڈمی کے عہدہ داران بنانے کے لئے پروگرام طے کیا گیا۔ نیز ہندو بیرون ہند کے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا گیا جنھوں نے اکیڈمی سے ہر ممکن تعاون و اشتراک کا اظہار کیا۔

جلسہ میں پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، پروفیسر عبدالاحد خاں خلیل، محمد مسیح صدیقی پرنسپل، سید اکرام الحق، شجاعت علی سندیلوی، نسیم احمد دانش محل، عرفان لکھنوی، محمد اسحاق صدیقی وغیرہ نے شرکت فرمائی۔

جلسہ آئندہ کارروائی کے لئے صدر کے شکریہ کے بعد برخاست ہوا۔

شجاعت علی سندیلوی (سکریٹری)

یوم حسرت

کراچی ۱۳ مئی ۔ مولانا حسرت موہانی مرحوم کی برسی پر ایک جلسۂ عام میں برصغیر کے مایہ ناز شاعر مفکر اور فلاسفر کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا گیا۔ یہ جلسہ حسرت میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام راجہ محمود آباد کی صدارت میں ہوا جس میں سردار عبدالرب نشتر چودھری خلیق الزماں، اور دوسرے سیاسی لیڈروں نے حاضرین سے خطاب فرمایا اور مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پاکستان میں بھارتی ہائی کمشنر مسٹر ڈیسائی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، خواجہ محمد اسمٰعیل خاں اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے پیغامات بھی جلسہ میں پڑھے گئے۔

سردار عبدالرب نشتر نے اپنی تقریر میں کہا کہ مولانا موہانی ایک عظیم لیڈر، ایک ممتاز ادیب ایک مخلص سماجی کارکن اور مسلمانوں کے سچے دوست تھے غریب بچے سے ان کی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ لوگ انھیں کمیونسٹ سمجھنے لگے تھے لیکن ان کو کمیونسٹ سمجھنا خود کمیونزم کے بنیادی اصولوں کے منافی تھا۔ کیونکہ یہ خدا کے اصول اور اس کے وجود سے منکر ہیں مگر اس کے برخلاف مولانا ایک سچے مسلمان تھے جو خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ انھوں نے متعدد حج کئے وہ ایک انتہا پسند تھے وہ بیباکی کے ساتھ حق و انصاف کے راستے پر چلتے تھے اور اس سلسلے میں سردار عبدالرب نشتر نے عوام سے اپیل کی کہ مولانا حسرت صاحب کی زندگی سے سبق حاصل کریں اور ان کی یاد کو نہ بھلائیں۔

ہمارے نمائندے کی اطلاع کے مطابق چودھری خلیق الزماں نے مولانا کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ برصغیر کے کسی رہنما نے عملاً ایسی اسلامی زندگی نہیں گزاری۔ جیسی مولانا کی تھی الشّہ پر ان کا ایمان غیر معمولی طور پر مستحکم تھا اور جس بات پر ان کا ایمان تھا اس پر وہ عمل کرتے تھے اور اس کا اعلان کرنے میں انھیں کبھی باک نہ ہوتا تھا۔

بمبئی۔ آج بتاریخ ۱۳ مئی ۵۸ء ایک جلسہ مولانا محمد علی میموریل اسکول کانپور میں بیادگار مولانا حسرت موہانی بصدارت جناب پرنسپل صاحب احمد اللہ صدیقی منعقد ہوا جس میں سالہائے گزشتہ کی طرح قرآن خوانی کے بعد مولانا مرحوم کی مجاہدانہ زندگی پر دو دلنگیز تقریریں ہوئیں اور ادارہ کے بچوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنی زندگی کو مولانا مرحوم کے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کریں تاکہ فلاح دارین حاصل ہو طلبائے تقریروں اور نظموں کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

(اسلم تہدی)

اپنی خاطر

مانا کہ ہر اک طرح کے حائل غم ہیں
آجاؤ کہ پھر بزم میں تنہا ہم ہیں
ملتے ہیں کہاں ایسے محبت والے
اس دور میں دیوانے بہت ہی کم ہیں

سو طرح کے صدموں سے گزرنا کیسا
جینا ہے تو گھٹ گھٹ کے یہ مرنا کیسا
یہ لوگ کبھی ہم کو نہ جینے دیں گے
لڑنا ہے زمانے سے تو ڈرنا کیسا

طوفان نیا پھر سے اٹھا، دیکھیں تو!
دیوار گری، شور ہوا دیکھیں تو!
اک جنت میں ملے راہ محبت ہوگی
روکے گا ہمیں کون ذرا دیکھیں تو

کہتے رہیں یہ لوگ کہ اچھا نہ ہوا
وہ کون سا عاشق ہے کہ رسوا نہ ہوا
آزاد رہو اپنی محبت کے لئے
یہ کیا ہے کہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا

(باقر مہدی)

اُردو کے بانی

حضرت امیر خسرو کے عرس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے وزیر خوراک شری اجیت پرشاد جین نے کہا کہ حضرت خسرو نے جو شمع جلائی تھی اس کی روشنی صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ ابھی غیر ممالک کے کئی سفیروں نے بھی ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ حضرت امیر خسرو کا یہ احسان ہی کیا کم ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو جنم دیا جو ملک کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے جسے کروڑوں لوگ بولتے ہیں اس سے محبت کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ یہ زبان ترقی کرے گی اور انسانوں میں محبت پیدا کرے گی۔

ایران میں یوم اقبال

تہران ۱۴ مئی یہاں تہران یونیورسٹی میں یوم اقبال منایا گیا۔ اس موقع پر وزیر اعظم ایران اور جنرل رضا نے اپنی تقریروں میں کہا کہ ہمیں اقبال کی آواز پر دھیان دیتے ہوئے اپنی مشترک تہذیبوں اور بھائی چارے کو تقویت دینی چاہئے اور عالمی امن اور معاشی یکجہتی کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہئے۔

آثار ادبیہ

مختار الدین احمد

اشعارِ ذوق

ذوق کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب نہ ہو سکا۔ شیفتہ [illegible]ھ میں لکھتے ہیں: ہنوز بہ ترتیب دیوان نہ پرداختہ۔ ذوق کی وفات (۱۲۷۱ھ) کے آٹھ سال بعد حافظ ویران نے ان کے اشعار یہاں وہاں سے جمع کئے اور دیوان مرتب کر کے شائع کیا اس ایڈیشن میں دو نقص ہیں، یہ مختصر ہے اور سارے کلام پر مشتمل نہیں اور پھر یہ کہ کئی شعر سکندر، معروف اور منشی احسان اللہ تجمّل شاگرد ذوق ہے کے دیوان میں داخل ہو کر غلطی سے ذوق کی طرف منسوب ہو گئے ہیں۔ محمد حسین آزاد کے ایڈیشن میں کلام میں معتدبہ اضافہ ہے لیکن اس ایڈیشن کو بھی مکمل اور مستند نہیں کہا جا سکتا۔

آزاد نے بقول شیرانی مرحوم، بہت سی غزلیں خود تصنیف کر کے ذوق کے دیوان میں اضافہ کر دی ہیں اور استاد کے بچپن کے کلام سے انہیں موسوم کر دیا ہے۔ یہ کہنا کہ دیوان ہذا میں کس قدر تعداد غزلیات مولانا کی کاوشِ طبع کی مسنون ہے بہت دشوار ہے البتہ اس قدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی تمام غزلیں جو ذوق کے رنگ میں نہیں نہ حافظ ویران کے یہاں موجود ہیں اور جن کو مولانا استاد کے کلام سے یاد کرتے ہیں۔ شک و شبہ کی مرکز ہیں۔

اس نقص کے ساتھ ساتھ کہ بہت سے اشعار آزاد کے تراوشِ قلم کا نتیجہ ہیں جنہیں انہوں نے ذوق کی طرف منسوب کر دیا ہے اس ایڈیشن کی ایک کمی یہ بھی ہے کہ یہ ذوق کے سارے کلام پر مشتمل نہیں۔ تذکروں اور قدیم بیاضوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے اور ذوق کے عہد کے اخباروں کی بھی چھان بین کی جائے تو اُن کے کچھ اور اشعار روشنی میں آ سکتے ہیں۔

ذیل میں تین نادر اور کمیاب تذکروں سے ذوق کے تراجم اور ان کے اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ یہ تذکرے علی الترتیب عمدۃ المنتخبہ (سرور)، عیار الشعرا (خوب چند ذکا) اور تذکرۂ صدر الدین آزردہ ہیں

ذوق کے سلسلے میں ان تذکروں کی اہمیت یہ بھی ہے کہ ان کے مصنفین ذوق کے معاصر ہیں اور یہ اس وقت لکھے گئے ہیں جب ذوق کا عالمِ شباب تھا۔ اشعار ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳ اور ۲۷ دیوان مطبوعہ میں نہیں ملتے اور بالکل نئے ہیں۔ بقیہ شعر دیوان میں موجود ہیں۔ لیکن ان میں بیشتر کی روایت روایتِ دیوان سے مختلف ہے اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ذوق نے ابتدا میں کیا لکھا تھا۔ اور پھر بعد میں اس میں کیا ترمیم کی۔ مثال کے طور پر

یارب کوئی کا تارا ہوں یا آسماں کا ہوں
نام آسماں پہ میرا ہے زیرِ زمیں ہوں میں

یہ شعر پہلے اس طرح تھا۔

تارا سا ہوں کوئیں کی میں تہ پر مثالِ آب
گو نام آسماں پہ ہے زیرِ زمیں ہوں میں

اشعار [illegible] دیوان میں موجود نہیں لیکن اسی غزل کے دوسرے تین شعر موجود ہیں۔ شعر ۱۱ دیوان مطبوعہ میں موجود ہے (آزاد ایڈیشن ص ۲۶۳) اس پر آزاد کا یہ نوٹ درج ہے۔ عالمِ شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہو رہا تھا۔ اور آخر عمر میں آکر غزل پوری ہوئی ۱۲۷۰ھ میں تیس برس کی بات میں کہی تھی" یہاں تذکرہ عیار الشعرا میں اس کے ساتھ چوہ شعر درج ہیں۔ ان کا دیوان مطبوعہ میں پتا نہیں۔ میرا قیاس ہے کہ پوری غزل عالمِ شباب کی ہے، یا تو بعد کو غزل غائب ہو گئی اور صرف مطلع ذوق کو یاد رہ گیا یا انہوں نے غزل کے بقیہ اشعار نظری ٹھہرا دئے، مطلع پسند آیا وہ رکھ لیا، بعد میں بقول آزاد ۱۲۷۰ھ میں نئی غزل کہی اور اس مطلع کو اس میں رکھ لیا۔

اب تینوں تذکروں سے ذوق کے تراجم اور ان کے اشعار درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) تذکرۂ عمدۃ المنتخبہ

ذوق تخلص، شیخ محمد ابراہیم شاگرد حافظ غلام رسول شوق جوانیست باشندۂ دار الخلافہ۔ قدا یہ خوب خوب الذہن معاش موزوں شدہ و در غزل گوئی نیز ممتاز است و مضامین رنگین زمی آرد۔ طبعش در ریختہ گوئی رسا افتادہ غرض کہ مغتنم وقت است۔ از افکار اوست:-

۱- چاندنی نے شب جو یہ روپ یہ دکھایا تھا
مجھ کو ماہتابی پہ دھوپ میں بٹھایا تھا

۲- سے ہمارا اوس کے وقت ذبح نہ پیاسے سے
یہ تنیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

(باقی آئندہ)

---

[1] غلط انتساب کی بھی ایک آدھ مثال مل جاتی ہے۔ شعر مندرجہ ذیل

آخر گل اپنی خاک در میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بیت معمولی سے اختلاف کے ساتھ گلشن بے خار میں مرزا جہاندار شاہ جہاندار کے نام سے درج ہے

[2] تذکرہ ابن طوفان میں ذوق کی طرف چار شعر دیئے ہوئے ہیں، جہاں کو ٹھا منسوب ہیں، دیوان مطبوعہ میں موجود نہیں۔

حسرت موہانی

رحم علی الہاشمی

ادیب، مصنف، فنکار اور شاعر کی شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق مضمون مختصر بھی ہو سکتا ہے اور طویل بھی لیکن جو شاعر یہ کہے کہ

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اس کے متعلق کوئی مختصر مضمون لکھنا آسان نہیں ہے اس لئے کہ اس کی زندگی کے کئی پہلو ہو جاتے ہیں اور ہر پہلو کے متعلق کچھ نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حسرت موہانی نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کے شاعر تھے بلکہ جنگ آزادی کے ایک بہادر سورما، ایک اہل خاندان گرہست، ایک مصنف، ایک جرنلسٹ اور ایک اصول پرور انسان تھے۔ اور جس شعبۂ زندگی میں انھوں نے قدم رکھا اس میں چند اصول کو پیش نظر رکھ ان پر سختی سے عمل کیا۔ شاعری میں بھی ان کے کچھ اصول تھے اور گو ان اصول سے ہم متفق نہ ہوں تو بھی ہم ان کی تعریف کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ انھوں نے ان اصول کو پورے طور پر برتا اور اس میں کسی قسم کا سمجھوتا گوارا نہیں کیا۔ حسرت خاص طور پر جذباتی شاعر تھے اور انھوں نے غزل گوئی میں امتیاز حاصل کیا۔ عام طور پر غزل گو شعراء کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی غزل کے مختلف اشعار میں بالکل متضاد خیالات اور جذبات کا اظہار کریں۔ چنانچہ اگر ایک شعر میں وہ مرے ہوئے قبر میں لیٹے ہوتے ہیں اور فاتحہ کے لئے آنے والوں کو ہدایتیں دے رہے ہوتے ہیں تو دوسرے ہی شعر میں جام و مینا کے ساتھ لب جوئبار پر معشوق کے عشوہ و ناز کا لطف اٹھا رہے ہوں گے ایک ہی غزل کے ایک شعر میں صدمت، فراق اور ہجر و جدائی کی راتوں کا ذکر ہوگا تو دوسرے شعر میں معشوق کے کاکل عنبریں بر دوش لطف وصال سے رگ رگ میں حرارت حاصل کر رہے ہوں گے۔ اس طرز غزل گوئی کے حسن و قبح پر بحث کئے بغیر ہم یہ کہیں گے کہ حسرت موہانی اس کے خلاف تھے اور ان کے اصول کے بموجب جذبات کا تسلسل و توافق غزل کے لئے ضروری تھا۔ چنانچہ ان کی تمام غزلوں میں یہی اصول کار فرما نظر آتا ہے۔

ایک اور خصوصیت حسرت کی شاعری کی یہ ہے کہ ان کے اشعار میں خود ان کے جذبات ہوتے ہیں اور دوسروں کے جذبات مستعار لینے سے وہ سختی کے ساتھ پرہیز کرتے ہیں ان کا عقیدہ تھا کہ شاعر جو کچھ کہے وہ خود اس کے دل و دماغ کا نمائندہ ہو یہاں بھی ممکن ہے کہ ہم ان کی رائے سے متفق نہ ہوں مگر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ حسرت کی شاعری خود ان کے جذبات کی آئینہ دار ہے اور یہ جذبات بلا کسی تصنع یا ادرد کے ظاہر کئے گئے ہیں جس سے ان کے اشعار میں خلوص اور صداقت پیدا ہو گئی ہے جو انھیں کا حصہ ہے۔ افلاطون کے نزدیک صداقت شاعری کا عنصر اصلی ہونا چاہئے اور اس معاملے میں ان کا اصول اتنا سخت تھا کہ انھوں نے یونان کے بلند پایہ شعراء کے کلام سے واقفیت کے باوجود اپنی جمہوریہ میں شعراء کو جگہ نہیں دی۔ گو عملی دنیا میں اس جمہوریہ کا افلاطون سے پیشتر یا بعد کو تاریخ کے کسی دور میں ظہور نہیں ہوا۔ آج اگر افلاطون زندہ ہوتے تو وہ حسرت کو اپنی جمہوریہ کی اسکیم سے خارج نہیں کر سکتے تھے۔

ایک تیسری خصوصیت حسرت کی شاعری کی ان کی انتہا پسندی ہے وہ فطرتاً انتہا پسند تھے اور جس بات کو درست سمجھتے تھے اس میں کسی قسم کے سمجھوتہ یا لین دین کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ ملک و قوم کی آزادی کامل کا عقیدہ ان کا جزو ایمان تھا جس کی وجہ سے وہ کانگریسی تحریک کے ساتھ پورا پورا تعاون نہ کر سکے اور نہ مسلم لیگ ہی میں کھپ سکے بلکہ جہاں کہیں بھی گئے اپنے اصول کی جنگ میں تنہا رہے اور اپنے عزم و استقلال اور جرأت و ایثار کے باوجود قوم کے لیڈر نہ بن سکے یہ خصوصیت ان کی شاعری میں بھی جلوہ گر ہے اور یہ اس کے اظہار میں وہ مطلق تامل یا خوف و ہراس کو جگہ نہیں دیتے۔

لیکن ان تمام خوبیوں یا خامیوں کے باوجود وہ ایک بہت ہی بلند پایہ شاعر تھے۔ اس لئے کہ ان کی شاعری میں علاوہ خلوص اور صداقت کے حسن بیان کی اعلیٰ خصوصیت بھی موجود ہے اور وہ الفاظ محاورات، تشبیہات و استعارات کو اس خوبی اور صفائی سے استعمال کرتے تھے جو نقش معنی کے لحاظ سے ہر طرح موزوں ہوتے تھے اور اس طرح اعلیٰ درجے کی شاعری کی تیسری خصوصیت حسن ادا بھی ان کا خاص حصہ تھی۔

حسرت ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ بہت بڑے مصنف بھی تھے اور متعدد ادبی کتابیں خصوصاً فن شاعری پر مثلاً محاسن سخن، معائب سخن، انتخاب شعراء وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔ وہ ایک ادبی ماہنامہ کے ایڈیٹر بھی تھے جس میں خود ان کے کلام کے علاوہ قدیم و جدید مشاہیر شعراء اردو کے کلام کا انتخاب زندگی کے حالات اور تنقید کی ہے۔

حسرت کے کتب خانہ میں علاوہ منتخب علمی اور ادبی کتابوں کے اکثر اخبارات و رسائل کے مکمل فائل بھی تھے۔ معلوم نہیں یہ بیش قیمت ذخیرہ اب کس حالت میں ہے۔

خطبہ تقسیم اسناد ہندی پرچار سبھا حیدرآباد

(از ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین)

مجھے بہت خوشی ہے کہ میں آج آپ کا دو سال پرانا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ ہندی پرچار سبھا نے عرصہ ہوا مجھے اپنے سالانہ کنووکیشن میں شریک ہونے کے لئے بلایا تھا لیکن خدا بھلا کرے دفتری دھندوں کا کہ ان کی وجہ سے اب تک نہ آسکا اس دیر کی معذرت کے ساتھ ساتھ مجھے آپ کا دلی شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ نے اس موقع پر مجھے یاد کرکے میری عزت بڑھائی۔ یہ احساس اس حالت میں اور زیادہ ہوجاتا ہے جب کوئی شخص یہ جانتا ہو کہ اسے اس عزت کے پانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میری زندگی پڑھنے پڑھانے میں اور آخری حصہ دفتر کی چکی چلانے میں گزری ہے۔ زبان اور ادب کی خدمت کا کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا۔ البتہ اتنا ضرور سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان کی میرے دل میں عزت ہے اور ان کے کام کے لئے پریم۔ ایسے ہی خاموش تعمیری کاموں کے ذریعے قومیں بنتی ہیں۔ ہندی پرچار سبھا کے کام اور اس کی خاموش خدمت سے میں واقف ہوں لیکن نہ اس قدر جتنا ہونا چاہئے۔ البتہ اس موقع پر آپ کے کام کو دیکھ کر یہ واقفیت بڑھ گئی ہے۔ مجھے کل ہی آپ کے کاموں کی ایک رپورٹ پڑھنے کا موقع ملا جس سے اندازہ ہوا کہ آپ نے دھیرے دھیرے پچھلے ۱۵ برس میں اس کو کس طرح بڑھایا اور پھیلایا ہے۔ لیکن کسی کام کی قدر و قیمت کا اندازہ محض اس کے پھیلاؤ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقصد کی معقولیت اور دیانت سے ہوتا ہے۔ اگر مقصد کو سمجھداری کے ساتھ مقرر کیا گیا ہے تو تھوڑا کام بھی دور تک پہنچتا ہے۔ اگر مقصد ہی درست نہیں تو جتنا بھی آپ آگے بڑھیں گے یا تیز چلیں گے اصل منزل دور ہوتی چلی جائے گی۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے زبان کے بارے میں جو پالیسی رکھی ہے اس میں گاندھی جی کی نظر اور ہدایت کا فیض جاری ہے اور (اگر میں انکسار کے ساتھ یہ عرض کرسکوں) اس میں مجھے ان خیالوں کا عکس بھی نظر آتا ہے جو زبان کے پرچار اور اس کے بنانے کے سلسلے میں برسوں سے میرے دل اور دماغ پر حاوی رہے ہیں۔ آپ نے اپنی رپورٹ میں اس پالیسی کو جس طرح بیان کیا ہے اس کو دہرانا بے موقع نہ ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ دیوناگری لپی میں ہندی زبان ملک کی عام زبان بنے۔ لیکن اس میں جو لفظ باہر سے آکر داخل ہوگئے ہیں ان کو قائم رکھا جائے۔ اس زبان کو ایک ایسی سادہ اور میٹھی زبان بنانے کی ضرورت ہے کہ وہ کسی خاص طبقے یا جماعت کی زبان نہ سمجھی جائے بلکہ عام جنتا کے دل کی پکار بن سکے یعنی ہم ہندی کے اس اسٹائل اور روپ کے حامی ہیں جس کا ذکر ملک کے دستور میں کیا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سبھا سیاست اور زبان اور جماعتی جھگڑوں سے بالکل الگ رہے اور مقامی زبانوں کی ترقی میں حصہ لے اس طرح وہ بھی پھلیں پھولیں گی اور ہندی ان کے اور ملک کے سارے حصوں کے درمیان ایک پل کا کام دے گی۔ کارکنوں کی یہ پالیسی ہر طرح قدر کے قابل ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ زبان کے اس طوفان میں جس نے پچھلے دس برس میں اپنا سر اٹھایا ہے آپ کے قدم نہیں ڈگمگائے۔

اس موقع پر آپ کے کاموں کے بارے میں کسی مفصل تنقید کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں زیادہ تر دوست ایسے ہیں جو اس سے اچھی طرح واقف ہیں ایک لاکھ آدمیوں کا ہندی پڑھ جانا۔ قیدیوں اور ہریجنوں کی تعلیم کا انتظام کرنا۔ استادوں کو ٹریننگ دینا۔ دو اسکول اور ایک کالج چلانا۔ پستکالیہ کا قائم کرنا اور علمی اور عام دلچسپی کی کتابوں کا شائع کرنا۔ جن میں بچوں، بالغوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے مذاق کی چیزیں شامل ہیں ایک اچھے پریس کا قیام۔ یہ سارا پروگرام آپ کے مقصد کی خوبی اور وسعت کا ثبوت ہے۔ مجھے خاص طور پر اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کی اس سبھا نے صرف حکومت ہی سے نہیں بلکہ دوسری زبانوں کی انجمنوں سے بھی مل جل کر کام کیا ہے۔ اور

ان کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ زبان کی پیدا کی تنگ خیالی اور سرمایہ داری بڑی خطرناک چیزیں ہیں۔ شکر ہے کہ آپ نے اپنے دامن کو ان سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس بات پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

دوستو! دیس کے آزاد ہونے کی وجہ سے ہم پر بہت سی نئی ذمہ داریاں اور نئے بوجھ پڑے ہیں لیکن تمام کٹھنائیوں کے باوجود ہمارا فرض ہے کہ ہم ہمت اور خوش دلی کے ساتھ انہیں دھائیں اور کتنے بہت سے اور مختلف کام ہیں یہ۔ دیس کی مالی حالت کو سدھارنا اور جنتا کی زندگی کے معیار کو بڑھانا ہے صنعت وحرفت اور کھیتی باڑی کو پھیلانا اور نئے اور ترقی یافتہ راستوں پر ڈالنا ہے۔ دیس کو بیماری اور جہالت کو نکالنا ہے دلوں کی تنگی اور دماغوں سے اندھیرے کو نکالنا ہے۔ ریت رسم اور ذات پات کے جو بندھن ہماری زندگی کو لوہے کی سی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ان کو توڑنا ہے۔ دو صدیوں کی غلامی نے ہماری جنتا کی شکتیوں کو جو زنگ لگا دیا ہے اس کو صاف کرنا ہے۔ ملک میں جو دل توڑنے والے بھید بھاؤ پیدا ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے خود آزادی کی ناؤ کشتی بھنور میں آ گئی معلوم ہوتی ہے ان کو ختم کرنا ہے اور صرف دیس کے اندر ہی نہیں بلکہ دیس کے باہر دنیا میں بھی جو آج گویا ہمارے دروازے پر آ کھڑی ہوئی ہے۔ امن اور شانتی کے خیال کو پھیلانا ہے ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ ہماری ساری تہذیب اور تمدن ہمارے کلا کے امر شاہکار ہماری قدریں، ہماری زندگی کے سنہری اصول جنھوں نے صدیوں کی جانچ کرنے والی آنکھوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ ہمارے بھگتوں کے گیت، ہمارے صوفیوں کا تصوف، ہمارے ادیبوں کا ساہتیہ یہ سب چیزیں جنگ کی آگ میں بھسم ہو جائیں گی۔ اس وجہ سے تو شاعر نے آج سے پچاس برس پہلے یہ سندیسہ دیا تھا۔

> مکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
> دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

میں اس موقعے پر یہ ذکر کیوں کر رہا ہوں۔ ایک تو یہ یاد دلانے کے لئے کہ ہماری قومی زندگی کی بنیاد محض دھن دولت اور قوت کی تلاش پر نہیں رکھی گئی بلکہ بعض اخلاقی سدھانتوں پر رکھی گئی ہے جن کا پالن ہمارا فرض ہونا چاہئے۔ اس بات کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔ آج کی دنیا میں اور خود ہمارے دیس میں ایسے لوگ اور گروہ موجود ہیں جو چاہے زبان سے ان اصولوں کا دم بھریں۔ لیکن اصل میں ان کے من میں زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے لئے دولت، قوت اور اقتدار حاصل کریں۔ موجودہ دور کی تباہ کاریوں کے رعب میں آ کر ان کا خیال یہ ہو گیا ہے کہ شانتی کا پیغام خواہ وہ پرانے رشیوں منیوں اور نبیوں اور صوفیوں نے دیا ہے یا گاندھی اور نہرو کی زبان اور دل سے نکلا ہو۔ اس زمانہ کی ضرورتوں سے اس کی آب و ہوا سے اس کی مادیت سے میل نہیں کھاتا۔ یہ زمانہ تو قوت اور اہنسا کی رسہ کشی کا ہے۔ مدت ہوئی ایک انگریز اخبار نویس نے اس بھٹکی ہوئی ذہنیت کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی تھی۔

"اب کسے فکر ہے کہ تصویریں بنائے یا شاعری کرے یا زبان کے میدان میں معنی پیدا کرے یا اس کی ساخت کے بارے میں دماغ لڑائے۔ یہ تو ایسا معلوم ہوگا جیسے روم میں آگ لگی ہو اور کوئی بیٹھا بانسری بجائے ———— کسے فکر ہے کہ اخبار اور رسالے نکالے اور کاغذ پر روشنائی یا فضا میں فکر انگیز جملے پھینکے وہ تو جنگ کے نقارخانے میں طوطی کی آواز بن جائیں گے یا ان آشاؤں اور منیوں کا ترجمہ پڑھے جو اب باسی ہو گئی ہیں۔ اب فکر کا چراغ جلانے سے کیا حاصل۔ پیادہ فوجوں اور ہوائی جہازوں اور ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کے مقابلے میں ایک نقاد کی زبان جاننے اور سکھانے والوں کی کیا حیثیت ہے۔"

(باقی آئندہ)

(پرنٹر پبلشر اطہر پرویز نے نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا)